سدرہ اشرف
پی ایچ ڈی اسکالر
شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

مثنویاتِ امیرؔ کا عہد اور ان کا ذہنی اور فکری ادراک

ABSTRACT

Ameer menai's epoch and his sagacious and intellectual perceptions.

By Sidrah Ashraf, PhD Scholar, Dept. of Urdu, University of Karachi.
Ameer Ahmad Ameer Meenai was a poet of urdu and Persian.He is also known as a lexicographer, sufi, scholar, editor, prose writer, translator. He wrote poetry in almost every genre including ghazal, na'at, qasida, masnavi, tarkib band and tarji band. Ameer Meenai started his poetic career from Lucknow and shifted to Rampur after the destruction of Lucknow.He created the best of poetry during the reigns of Nawab Yusuf Ali Khan and Nawab Kalab Ali Khan. His Masnaviyat or poetic collection of anecdotes and stories show glimpses of 2 eras. Besidesbeing impressed by the civilization of Lucknow and glimpses of peaceful life of Rampur ,he was also impressed by the Sir Syed movement because the poetry of his last days portrays simplicity and purposiveness.Ameer'smasnivyat are steps or transition from the ancient era to the modern one which has been studied in the under view article.

Keywords: Masnavi, Era, Story, civilization, Lukhnow, Awadh, Rampur, Nawab Yousuf Ali khan Nazim, Nawab Kalb-e-Ali Khan.

اردو زبان و ادب میں مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس کا آغاز اردو کی تاریخ کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ مثنوی ''کدم راو پدم راؤ'' اور دیگر ابتدائی مثنویات اس بات کا ثبوت ہیں۔ کسی بھی عہد کے بدلتے حالات و واقعات اس دور کی شاعری پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثنوی نے ہر عہد کے مزاج کو قبول کیا ہے۔ مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس کو ہیئت کے لحاظ سے بھی دیکھا جاتا ہے اور موضوع کے لحاظ سے بھی۔ ہیئت کے لحاظ سے ایسی نظم جس کے ہر دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔(۱) موضوع کے لحاظ سے آغاز میں اس میں کوئی منظوم کہانی یا داستان پیش کی جاتی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مثنوی

اپنے موضوع کے لحاظ سے وسعت اختیار کر گئی۔اس کے باوجود منظوم داستانوں اور واقعات کے بیان کے لیے یہی صنف سب سے زیادہ موزوں رہی۔اگر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سیاسی اور ادبی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جب نادری، ابدالی، مرہٹوں اور روہیلوں کی تاخت و تاراج کی وجہ سے دہلی برباد ہوگئی تو یہاں کے فن کاروں نے جن شہروں کا رخ کیا ان مقامات میں لکھنؤ ہی وہ مقام تھا جہاں اہلِ فن کو قرار تھا۔(۲)

آصف الدولہ اور ان کے جانشین سعادت علی خان کے زمانے تک اودھ مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔یہاں کے حکمران سلطنت مغلیہ کی طرف سے اس پر حکومت کرتے تھے لیکن بادشاہ صرف شطرنج کے بادشاہ ہی رہ گئے تھے۔انگریزوں نے آہستہ آہستہ اودھ کے حکمرانوں کو اپنے زیر کرنے کے لیے ان کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیے، سونے پہ سہاگا کہ حکمران بھی ایسے جو اپنے عہدے کے اہل نہیں ہوتے تھے محض سفارشوں اور تعلقات کے بل پر منصب حاصل کر کے نظم و نسق کو زیر و زبر کرتے رہتے۔(۳)

اودھ کا علاقہ بڑا زرخیز تھا۔عام خوشحالی کے علاوہ یہاں کے حکمراں بے اندازہ دولت کے مالک تھے، دولت کی افراط، انگریزوں کی سیاست میں مداخلت، تفنن و تعیش کی فراوانی، حکمران خاندان کا ایران سے نسلی تعلق، اودھ کی رومان انگیز روایات، طوائفوں کی حکومت، یہ ابتذال لکھنؤ کی معاشرت کے امتیازی نشان تھے اس دور میں اس قدر میلے ہوئے کہ اس عہد کے لکھنؤ کو میلوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔جشن وجلوس، مینا بازار، عروس، رام لیلا، ہولی، بسنت، مرغ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی، طوائفوں کا ناچ، بھانڈوں کی نقلیں، پیرا کی کے مقابلے، سپہ گری اور پہلوانی وغیرہ۔(۴) شاعری میں الفاظ کی مرصع کاری، صنائع بدائع کا غیر ضروری التزام تھا یوں تو تمام صنعتیں استعمال کی جاتی تھیں لیکن رعایت لفظی کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔

لب اس کے پستہ، ذقن سیب، آنکھیں ہیں بادام
کھلے جو دانت ہنسی میں نظر انار آیا(۵)
(ناسخ)

دوپٹا اوڑھ کر آب رواں کا سرخ انگیا پر
رلایا باغ میں اس گلبدن نے خوب شبنم کو(۶)
(جرأت)

غزل تو غزل تمام اصناف پر رعایت لفظی کا رنگ غالب تھا مثنوی گلزار نسیم اسی رنگ میں ہے۔مرثیے میں دبیر نے اس کا خاص التزام کیا ہے۔اردو ادب کے یہ تصورات و روایات تھیں جو لکھنؤ میں پیدا ہونے کی وجہ سے امیرؔ مینائی کو ورثے میں ملی تھیں۔امیر احمد امیر مینائی انیسویں صدی کے ایک باکمال شاعر تھے وہ ۱۸۲۹ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔وہ مظفر علی

اسیرؔ کے شاگرد تھے۔امیر مینائی بھی اپنے استاد کی طرح واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔امیر مینائی کے پہلے مطبوعہ دیوان مراۃ الغیب(۷)میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں جن میں لکھنؤ کی رونق اور واجد علی شاہ کا ذکر ہے۔

ہے اگر گردوں مخالف غم نہیں مجھ کو امیر
ہوں میں ظل دامن شاہِ ابو المنصور میں(۸)

امیر مینائی واجد علی شاہ کے دربار سے چار سال وابستہ رہے تھے۔شاہ مینا اور فرنگی محل سے وابستہ شاعر کی طبیعت میں تقویٰ تھا۔رندی اور ہوس نا کی نہ تھی۔واجد علی شاہ سے امیر کی دلی وابستگی کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی۔امیر غدر سے پہلے دربار میں اپنی شناخت بنا چکے تھے۔اسیر کے توسط سے وہ دربار میں شہزادے کے اتالیق کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور"انشائے نادری"لکھی۔اس کے علاوہ دوسو اشعار کی مثنوی"کبوتر نامہ"لکھی۔واجد علی شاہ کی فارسی کتاب"صوت المبارک"کی شرح نغمہ قدسی اور انھیں کے دو مختصر عربی متن"ارشاد السلطان"اور"ہدایت السلطان"کی فارسی شرحیں لکھیں۔(۹)

انتزاع سلطنت کے وقت واجد علی شاہ ہی اودھ کے بادشاہ تھے۔ان کی معزولی پر ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔گلزار اودھ تو تاراج ہوا ہی تھا ساتھ ساتھ ادبی فضا بھی درہم برہم ہوگئی۔(۱۰)اس کے بعد امیرؔ تلاشِ معاش میں کئی سال تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہے۔کاکوروی،کانپور،مین پوری اور پھر ہمیر پور کا سفر اختیار کیا بالآخر شیخ وحید الزماں کے توسط سے آپ کی دربار رام پور میں باریابی ہوئی۔(۱۱)

نواب یوسف علی خان ناظم والی رام پور نے ۱۲۷۵ھ کے آخر میں ان کو رام پور طلب کیا اور ان کو سو روپے ماہوار پر مفتی عدالت کے عہدے پر مامور کردیا۔(۱۲)اگرچہ اس وقت رام پور میں ہر قسم کے باکمال جمع تھے۔علامہ عبد الحق خیر آبادی،اسیرؔ،بحرؔ،داغؔ،جلالؔ،تسلیمؔ،شاغلؔ،حیاؔ،عروجؔ شعراء کے علاوہ جو عالم،محدث،فقیہہ،مورخ اور دوسرے علوم میں دسترس رکھنے والے لوگ تھے،ان کی بھی اکثریت یہاں پائی جاتی تھی۔خود نوابان رام پور پڑھے لکھے اور اہل ذوق تھے۔مثلاً نواب یوسف علی خان ناظم جنھوں نے نہ صرف علوم معقول و منقول کی تحصیل کی بلکہ اصلاح کے لیے اپنا کلام ان لوگوں کے سامنے رکھا جن کی نزاکت خیال مسلم ہے اور جن کا مذاق سخن نہایت پاکیزہ ہے پہلے مومن سے اصلاح لی،پھر غالب کو اپنا کلام دکھایا۔پھر مظفر علی اسیر کو اور اس کے بعد امیر مینائی کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خان امیر مینائی کو اس اعزاز کے قابل سمجھتے تھے۔یہی عظمتِ امیرؔ کی ایک واضح دلیل ہے۔(۱۳)

حضرت امیر مینائی حقیقت میں ایک عالم،فاضل مفتی تھے۔اس حیثیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کامل منشی بھی تھے۔ادب و انشاء میں مہارت حاصل کی تھی،اسی حیثیت سے ادب و شعر میں جو کمال انھوں نے حاصل کیا ان کے شایان شان تھا کیوں کہ ادب و شعر کی تکمیل کا تعلق براہ راست ایک باعلم دماغ سے ہوتا ہے۔امیر مینائی گوناگوں خصوصیات و کمالات کے مالک تھے۔صرف ایک شاعر کی حیثیت سے ہی ان کے کمالات کو نہیں دیکھا گیا بلکہ دربار رام پور میں امیر کی تمام

قابلیت واضح تھی۔(۱۴)جب امیر مینائی رام پور میں آئے اور انھیں نواب صاحب کے مصاحب خاص کی حیثیت حاصل ہوگئی تو انھوں نے اپنے استاد اسیرؔ کو بھی رام پور میں طلب کروالیا۔ دربار رام پور سے تعلق کے ساتھ امیرؔ مینائی کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا،شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا اورنواب یوسف علی خان نے امیرؔ کو عدالت دیوانی کا مفتی بنادیا تھا،لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا دور دورہ زیادہ ہوا اس لیے دو سال کے اندر عدالتی کام کو ہلکا کرنے کے لیے نواب نے ان کو محکمہ رجسٹری میں منتقل کردیا اور ان کی جگہ مولوی طالب حسن کو مقرر کیا۔امیر مینائی نے یوسف علی خان کے ساتھ تین سفر کیے۔(۱۵)

منشی صاحب کا ستارہ مائل بہ عروج تھا کہ نواب فردوس مکاں یوسف علی خان بہادر نے رحلت فرمائی۔۱۸۲۱ھ میں نواب خلد آشیاں کلب علی خان مسند نشیں ہوئے۔نواب خلد آشیاں بہادر کو فن شعر میں اپنے والد سے بھی کہیں زیادہ انہماک تھا۔دربار رام پور آپ کے زمانے میں رشک شیراز واصفہان بنا ہوا تھا۔صلحاء،علماء،شعراء،خوش نویس غرض کہ ہرفن کامل نواب صاحب بہادر کی قدر دانی وفیض گستری سے بہرہ ور تھا۔نواب کلب علی خان کی پایہ شناسی امیر مینائی کے لیے خصوصیت سے سازگار ثابت ہوئی۔ان کی ماہانہ تنخواہ اب سو روپے سے بڑھ کر دوسوسولہ(۲۱۶)روپے ہوگئی تھی۔نواب صاحب کے مصاحب خاص تو داغ دہلوی تھے لیکن ایک بار پھر فضیلت کی پگڑی امیرؔ مینائی کے سر بندھی۔(۱۶)

نواب کلب علی خان کے روز افزوں اعتماد اور گرویدگی کی وجہ سے اس دور میں امیر کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ولی نعمت کے کلام کی اصلاح مصاحبت درباداری اور مشغلہ شعر وسخن میں گزرنے لگا تھا۔پہلے کی طرح کسی مقررہ عہدے پر مامور ہونے کے بجائے اب وہ نواب کے استاد،درباری شاعر،مقرب خاص،راز دار اور صلاح کار سبھی کچھ تھے۔تصنیف کے اعتبار سے یہ بہترین دور تھا۔سب سے پہلے ان کے چھ واسوخت "شعلہ جوالہ" جلد اول میں شائع ہوئے۔(۱۷)اس کے بعد ان کا نعتیہ دیوان"محامد خاتم النبین"،"دیوان مراۃ الغیب"،"مفردات کا مجموعہ "گوہر انتخاب"،نعتیہ مسدسات،"ذکر شاہ انبیاء"،"صبح ازل"،"مسدس لیلۃ القدر"،"شام ابد"،مثنویات"نور تجلی،ابر کرم"اور رام پور شعراء کا تذکرہ"یادگار انتخاب"اسی زمانے میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔(۱۸)اسی دور میں نواب کلب علی خان کے بڑے صاحبزادے ذوالفقار علی خان کی شادی کے بیان میں ایک مثنوی"کارنامہ عشرت"اور ایک اور طویل عاشقانہ مثنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

امیر مینائی کا زمانہ یوں تو انقلابات کا زمانہ ہے لیکن اردو مثنوی کا شاندار دور بھی کہلاتا ہے۔اس عہد سے پہلے دلی میں اگرچہ مثنوی کی طرف کم توجہ دی گئی تھی لیکن پھر بھی انشاء اور جرات نے مثنویاں لکھیں۔میرؔ نے"دریائے عشق"جیسی مثنوی تخلیق کی جس کے انداز کو اپناتے ہوئے مصحفی نے"بحر المحبت"مثنوی لکھی۔آغاز سے امیرؔ مینائی کے عہد تک تو عاشقانہ موضوعات کا حصہ بنے یا پھر مذہبی موضوعات کو برتا گیا۔(۱۹)

متوسط دور(۲۰)میں مثنوی کا معیار لکھنؤ میں دراصل میر حسن کی مثنوی"سحر البیان کے لکھے جانے کے بعد بلند ہوا۔حسن اتفاق سے یہ مثنوی لکھنؤ کے ادبی ارتقاء کے ابتدائی زمانے میں لکھی گئی اور اسی لیے بعد کے مثنوی نگاروں کے سامنے

ایک بلند معیار قائم ہو گیا۔ بےنظیر اور بدر منیر کی داستان عشق اپنے فوق الفطرت عناصر اور نصب العینی ماحول کے باوجود حیات انسانی کی اصلی اور بنیادی صداقتوں اور فطرت انسانی کی غیر متغیر حقیقتوں سے معمور ہے۔(۲۱)سحر البیان میں ملکی و سیاسی حالات سے لے کر مذہبی، سماجی اور اخلاقی اور ادبی سارے حالات خوش سلیقگی سے نظم ہوئے ہیں۔اس مثنوی میں زبان و بیان کے سوا ساری فضا لکھنؤی تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہے۔(۲۲)لکھنؤ کا دور مرثیہ اور مثنوی کے لیے نئی زندگی لایا۔امام بخش ناسخ نے ایک مذہبی مثنوی "سراج" لکھی۔

کی خدا نے جو یہ زبان عطا　　　　بے بلا شک عطیرِ عظمٰی
اس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز　　　　اس سے پاتے ہیں لذّت ہر چیز(۲۳)

اس دور کے بڑے شاعر خواجہ حیدر علی آتش ہیں، حیرت ہے کہ خواجہ آتش نے یک قلم مثنوی کو چھوا تک نہیں۔(۲۴)لیکن آتش کے شاگرد دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم لکھ کر تاریخ مثنوی میں اک حسین اضافہ کیا۔"گلزار نسیم" کا قصہ ہندوستان کا مشہور قصہ ہے۔اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی صنعت گری ہے اور اس مثنوی پر ہندی تہذیب کا اثر نمایاں ہے، مثلاً مثنوی میں قالب بدلنے کا ذکر آتا ہے۔

ابھرے گا لگا کے جب یہ غوطا　　　　بن جائے گا آدمی سے طوطا
پہلے تو لال پھل کو کھائے　　　　انسان کا رنگ روپ پائے(۲۵)

اختصار اس مثنوی کا سب سے بڑا کمال ہے ایک شعر درمیان سے حذف کر دیجیے تو ساری داستان برہم ہو جائے۔(۲۶)گلزار نسیم" کی خارجی اور داخلی فضا یکسر لکھنؤ میں ڈوبی ہوتی ہے۔جو دبستان دہلی سے تقابل کے احساس کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔گلزار نسیم جس زمانے میں لکھی گئی وہ لکھنویت کے آغاز نہیں بلکہ اس کے شباب کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔گلزار نسیم کی فضا ایسی تھی کہ جس میں شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر لکھنوی شعراء نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ہر رنگ کی نمایاں خصوصیت صنعت ہی کو ٹھہرایا گیا۔رعایت لفظی یا ضلع جگت جو اول الذّکر کی ایک بد نما شکل تھی۔اس کے باعث ظہور میں آئی۔گلزار نسیم دبستان لکھنؤ کی پہلی اور آخری طویل مثنوی ہے جو ایک طرف لکھنوی مزاج اور شعر و ادب کی پوری نمائندگی کرتی ہے اور دوسری طرف دبستان دلی کی حریف بن کر آتی ہے(۲۷)امیر مینائی کا زمانہ بھی گلزار نسیم کے قریب کا زمانہ ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ رہنے والے آپ لکھنؤ کے تھے لیکن مثنوی میں دہلی کا رنگ غالب ہے آپ نے اپنے ماحول کا اثر زیادہ نہیں لیا بلکہ دونوں دبستانوں کو بڑی خوب صورتی سے برتا ہے۔واجد علی شاہ نے متعدد مثنویاں لکھیں "حزن اختر" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔اردو مثنوی میں جدت کے حوالے سے بڑا نام نواب مرزا شوق کا بھی ہے۔ان کی مثنویات فریب عشق، بہار عشق اور زہر عشق۔اس میں سے زہر عشق نے اداسی کی فضا اور حسرت ناک تمناؤں کے ساتھ اردو ادب کے قارئین کو اداس کر دیا۔

گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں　　چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں
ہوئی میری جو اس سے چار نگاہ　　منہ سے بے ساختہ نکل گئی آہ(۲۸)

شوق کی مثنویات اپنے اندر ایک نیا رنگ لے کر آئیں انھوں نے لکھنوی اسکول میں رہتے ہوئے اور اس دور کے روایتی رنگ سے نہ صرف بغاوت کی بلکہ عہد شباب میں بغاوت کی اور ناسخ کے رنگ میں رعایت لفظی کے ساتھ لکھنے کے بجائے انھوں نے دلی اسکول کی صفائی اور سادگی کو اپنایا۔لکھنؤ میں رہ کر ہی انھوں نے خواص لکھنؤ کی معاشرت کا مضحکہ اڑایا اور علی الاعلان بتایا کہ بڑے لوگوں سے شرافت کس طرح منہ موڑ چکی تھی۔(۲۹)

اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں کس قدر تبدیلی آچکی تھی اور موضوعات کے انتخاب میں بے باکی پائی جاتی تھی۔اب بادشاہوں کے روایتی قصوں، مافوق الفطرت عناصر کی آمیزش سے سجی ہوئی کہانیوں سے زمانہ آزاد ہو رہا تھا۔زہرعشق میں محبوبہ سے زیادہ ماں کے جذبات پر اثر اور غمگین کر دینے والے تھے۔

تیری غیرت پہ ہوگئی میں نثار　　کہ سخن ہائے میری غیرت دار
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو　　کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی　　کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا　　کوکھ میری اجڑ گئی بیٹا(۳۰)

مرزا شوق نے رسوائی، بدنامی اور اس کے سود وزیاں پر غور نہیں کیا، بلکہ شدید جذبات کا اک دھارا پھوٹا اور اشعار کی صورت میں اس نے اپنے بہاؤ کا ذریعہ نکال لیا۔جذبات اور محسوسات کی اسی بے باک روانے تخلیقی کارناموں کو تازگی اور شادابی بخشی ہے۔اس لیے شوق کی شاعری روایتی اخلاق پسندوں میں خواہ کتنی ہی عریاں، فحش اور بے مایہ کیوں نہ قرار پائے لیکن ادبی تاریخ میں اس کی حیثیت مسلم ہے۔

کوئی ادب محض اس لیے خراب نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی خاص فرد یا جماعت کے اخلاقی اصولوں پر پورا نہیں اترتا ادب اپنے دور کا ترجمان اور روح عصر کا محافظ وغماز ہوتا ہے۔یہ دونوں خوبیاں نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں ملتی ہیں۔(۳۱)مثنوی میں شوقؔ کے آتے ہی جو نئی روایت قائم ہوگئی تھی اسے شوق کے بعد بے شمار مثنوی گو شعرا نے اپنایا مثلاً صفیر بلگرامی کی مثنوی "فتنہ عشق"، بہار عشق اور فریب عشق کی طرز پر ہے۔

میں نے تو یہ سنا تھا ہے بیمار　　کیا ہوا آپ کا وہ سب آزار
تیری باتوں میں صاف بٹّا ہے　　مردوئے تو تو ہٹّا کٹّا ہے
لایا کیسا لگا کے گھاتوں پر　　پڑیں پتھر تمھاری باتوں پر(۳۲)

مثنوی کا یہ سفر یوں ہی زمانے کے انقلابات کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور امیر مینائی کے زمانے میں دو طرح کے گروہ

بن گئے ایک وہ جو قدیمی طرز پر مثنوی لکھ رہے تھے اور دوسرے مرزا شوق کی مثنویات سے متاثر ہو کر لکھ رہے تھے۔اسی دو طرح کے انداز پر لکھی جانے والی مثنویات کا سفر جاری تھا کہ ساتھ ہی ساتھ ہی ایک اور گونج سنائی دینے لگی جس میں جدت تھی،روایات سے بغاوت تھی اور وہ تھا مثنویات کا جدید رنگ جس کا آغاز سرسید کی تحریک سے ہوا۔(۳۳)اسی دور میں ساتھ ساتھ اسیرؔ،امیرؔ،تسلیمؔ اور جلال کی بھی طویل و مختصر مثنویات سامنے آتی رہیں اب مثنوی اپنے جلو میں بے شمار جلوے لیے ہوئے تھی۔موضوعات اب صرف عاشقانہ نوعیت کے ہی نہیں رہ گئے تھے بلکہ اس میں جدت پیدا ہو رہی تھی۔

اب اردو شاعروں اور انشاء پردازوں کی قدیم ذہنی اور رومان خیز زندگی کا کوئی قدردان نہیں رہا تھا اور وہ حقیقت سے دوچار ہونے پر مجبور تھے۔فطرتاً ان کا قدیم طرز خیال آہستہ آہستہ بدلنے لگا تھا۔اس تبدیل کا اثر مثنوی کی صنف پر انقلاب انگیز ثابت ہوا۔اس میں اسلوب اور ظاہری تمام تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اہم معنوی تبدیلی بھی رونما ہونے لگی۔اس تبدیلی میں بڑا حصہ اس دور کے چند نمایاں سخن پردازوں کا ہے،جن میں آزادؔ اور حالیؔ قابل ذکر ہیں۔آزاد نے جو مثنویاں لکھیں وہ قدیم موضوعات سے بالکل مختلف ہیں،لیکن انداز بیاں یکساں ہے وہی قدیم استعارے اور کنایئے شامل کیے گئے جو قدیم مثنویوں کی پہچان ہیں۔(۳۴)

اس کے برعکس حالی کی مثنویاں"برکھا رت"،"شکوہ ہند"،چپ کی داد وغیرہ حقائق اور مظاہر فطرت کا عکس ہیں۔اس کے بعد اسمٰعیل میرٹھی،اکبر الہ آبادی،شوق قدوائی سبھی نے جدید مثنویات کی طرز پر نظمیں لکھیں اس سلسلے میں ایک بڑا نام اقبال کا بھی ہے۔انھوں نے کئی مثنویاں لکھیں۔جن میں"خفتگان خواب سے استفسار""سید کی لوح تربت پر"،"انسان"،"پنجاب کے دہقان"،''ساقی نامہ'' وغیرہ شامل ہیں۔بچے کی دعا بھی مثنوی کی خوب صورت شکل ہے۔(۳۵)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا ہو میری
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — دردمندوں سے،ضعیفوں سے محبت کرنا(۳۶)

جوش نے بھی اس شعری صنف کو اچھا برتا ہے۔

خورشید طلوع ہورہا ہے — افسانہ شروع ہورہا ہے
جلوؤں کی ہے چھوٹ خار وخس پر — رقصاں ہے شعاع ہر کلس پر(۳۷)

آخری عہد تک آتے آتے حفیظ جالندھری مثنوی کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے جنھوں نے شاہنامہ اسلام لکھ کر مثنوی کی تاریخ ہی بدل دی حفیظ کا ایک اور کمال ہے کہ انھوں نے لمبی بحر میں مثنوی لکھی۔

خدا کے حکم سے مرسل نے جب رختِ سفر باندھا — جناب حاجرہ نے دوش پر لختِ جگر باندھا
پیمبر اپنا بیٹا اور بیوی ہم عناں لے کر — چلا سوئے عرب پیری میں بخت نوجواں لے کر
خدا کا قافلہ جو مشتمل تھا تین جانوں پر — مقرر جس کو ہونا تھا زمینوں آسمانوں پر(۳۸)

امیر مینائی کا عہد اگر چہ اردد کے دور متاخرین اور دور جدید کی خوب صورت کڑی ہے،لیکن یہ وہ دور تھا جب مثنوی اپنے موضوعات کے حوالے سے تبدیل ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ امیر مینائی کی مثنویات میں ہمیں تنوع ملتا ہے۔امیر کی زندگی میں ان کی صرف دو مثنویاں نورِ تجلی اور ابر کرم شائع ہوئی تھیں۔ بقیہ مثنویات جن میں مثنوی کبوتر نامہ،مثنوی در بیان جشن مسند نشینی نواب کلب علی خان،مثنوی در بیان جشن خلعت پوشی نواب کلب علی خان،کارنامہ عشرت،مثنوی عاشقانہ، حکایت اویس قرنی،قصہ یہودی تمام غیر مطبوعہ ہیں۔(۳۹)

امیر مینائی کی مثنویات واجد علی شاہ کے دور سے لے کر دور جدید میں رنگ حالی تک کے اثرات قبول کرتی ہوئی نظر آتی ہے آپ کی مثنویات کو آغاز سے دورِ سر سید تھا دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ امیرؔ مینائی نہ صرف پرانے انداز کو اچھی طرح نبھا رہے تھے بلکہ نئے دور کی نئی آوازوں کو بھی سن رہے تھے اسی لیے وہ مثنوی جو آپ نے امیر الغات کی مدد کی استدعا کے لیے نواب محبوب علی کو لکھی ہے اس میں جدید مثنوی کا رنگ غالب ہے۔

چوں کہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے دربار سے وابستگی کے بعد آپ کی حیثیت درباری شاعر کی تھی۔دربار میں رہتے ہوئے وہاں کے ماحول سے گہری وابستگی ہوئی۔واجد علی شاہ کے دور میں قیصر باغ کی رنگ رلیوں،پری خانہ اور میلوں ٹھیلوں کی سرگرمیوں نے یہ عالم پیدا کر دیا تھا کہ لکھنؤ کے گلی کوچے بازار والیوں سے بھر گئے تھے۔یہ سب مناظر امیر مینائی نے بہت قریب سے دیکھے تھے۔مزاج میں مذہب کا فروغ زیادہ تھا اس لیے نشاطیہ زندگی سے لطف اندوز تو نہ ہوئے،لیکن ان مشاغل کا قریبی مطالعہ کیا یہی وجہ ہے کہ آغاز کی مثنویات میں لکھنوی رنگ جھلکتا ہے۔(۴۰)

امیر مینائی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو آپ کا رجحان غزل اور نعت کی جانب تھا۔آپ نے پہلی بار مثنوی پر طبع آزمائی اس وقت جب آپ کو واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تھی یہ ۱۲۶۹ھ کا زمانہ تھا۔(۴۱)

اسی زمانے میں بادشاہ کو کبوتر اڑانے کا شوق ہوا امیر مینائی نے بادشاہ سلامت کے کبوتروں کی تعریف میں ایک مثنوی کبوتر نامہ کہہ کر پیش کی۔(۴۲)اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے مثنوی کا آغاز دیگر روایتی موضوعات سے ہٹ کر کیا تھا۔کبوتر نامہ مثنوی میں ۲۰۰ اشعار ہیں اور اس میں کبوتروں کی اقسام بیان کی گئیں ہیں۔تحریر بھی بہت خوب صورت ہے۔چوں کہ یہ دور ایسا تھا کہ اس میں کبوتر بازی اور بٹیر بازی ایک فن کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے مثنوی کبوتر نامہ میں امیر نے اسی خالص لکھنوی رنگ کو پیش کیا ہے۔

ارشاد ہوا ایک دن صاف　　منظور ہے نشر بوئے الطاف
ہاں ساتھ کبوتروں کے آئیں　　جتنے ہیں ملازمین لائیں
ہر سقف مکان ہو قافلہ قاف　　پریوں کے ہوں تخت چھتریاں صاف
بازاروں میں جا بجا اڑی دھوم　　لو چمکے کبوتروں کے مقسوم

سلطاں ہے کبوتروں کا خواہاں　　پریوں کا ہے مشتری سلیماں
سن کر یہ خبر ہر اک زباں سے　　طائر نکل آتے آشیاں سے
دھیان آیا ہما کو بھی یہ اکثر　　افسوس کہ میں نہیں کبوتر(۴۳)

اس مثنوی کو امیر مینائی نے نہ جانے ذاتی شوق کی بناء پر یا بادشاہ کی خوشنودی کے لیے کافی محنت سے تحریر کیا ہے۔اس میں کبوتروں کی بےشمار اقسام، ان کی نسل، ان کے رنگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔کہیں سرخ کبوتر ہیں تو کہیں زرد کہیں سبز تو کہیں جوگیا ہیں۔

سبزوں کے یہ سبز ہیں پر وبال　　مدحت میں زباں ہے سبزہ سان لال
(درصفت سبز)

لال ایسے کہ وصف میں زباں لال　　ہیں برق سے بڑھ کے برق تمثال
(درصفت لال)

وہ زرد کبوتروں کا عالم　　محبوب ہیں زرد پوش باہم
(درصفت زرد)

اس مثنوی کی زبان وبیان خالص لکھنوی رنگ میں ہے اور اس دور کی یادگار ہے جس دور میں نوابوں کی عیش وعشرت عروج پر تھی۔ بےفکری کا ماحول تھا ہرطرف درباری سطح پر کبوتر بازی، رقص وموسیقی اورشعر وشاعری کی محافل کا اہتمام ہوتا تھا۔امیر مینائی کی زندگی میں ان کی صرف دومثنویاں نورتجلی اور ابرکرم شائع ہوئی۔مثنوی "نورتجلی" میں امیر مینائی نے نور نامے کی طرز پر آنحضرت ﷺ کی ولادت اوران کے فضائل ومعجزات کو بیان کیا ہے۔یہ ۱۲۹۲ھ میں تاج المطابع رام پور سے شائع ہوئی۔مثنوی ابرکرم مذہبی حکایتوں اور مناجاتوں پر مشتمل ہے۔۲۰۰۱ اشعار کی مثنوی ہے۔یہ ۱۲۹۴ھ میں تاج المطابع رام پور سے شائع ہوئی۔(۴۴)

لکھنؤ کی فضا میں امیر کے ہوش سنبھالتے ہی جن افراد کی شاعری کا چرچا تھا۔اس میں خود واجدعلی شاہ،اسیر،منیر لکھنوی،صفیر بلگرامی،مرزا دبیر،بےخودلکھنوی،امیر اللہ تسلیم شامل تھے۔یہ وہ دورتھا جس میں مثنوی اپنی سادگی سے ہٹ کر واقعات کی بے جا طوالت اورصنعتوں کے بے دریغ استعمال سے سج کر اپنا روپ کھورہی تھی لیکن ایک خاصیت پیدا ہورہی تھی کہ زیادہ مثنویاں طبع زادقصوں پر لکھی جارہی تھیں اور بڑے قصوں کو ترک کیا جارہا تھا جیسے واجدعلی شاہ کی تینوں مثنویات "افسانہ عشق"،"دریائے تعشق"،"عشق نامہ" کے قصے طبع زاد تھے۔(۴۵) پھر اسیرؔ تھے جن کی مثنویات میں واقعات تسلسل کے ساتھ نہیں تھے لیکن انھوں نے شخصی اور مذہبی مثنویات لکھیں۔امین الدولہ کے بارے میں (شخصی) درۃ التاج،معارج الفضائل (مذہبی)۔گیان چندجین لکھتے ہیں جس زمانہ میں افق پنجاب پر جدید مثنوی کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ہندوستان بھر میں قدیم

رنگ کا ہنگامہ گرم تھا۔تقریباً چوتھائی صدی کی آویزش کے بعد قدیم مثنوی نے جدید مثنوی کے لیے میدان چھوڑا جدت آنے کے باوجود بھی بہت سے شعراء نغمہ شبی گاتے رہے۔(۴۶)امیر مینائی نے جو مذہبی مثنویات لکھی ہیں ان میں نور تجلی،ابر کرم،حکایت اویس قرنی،قصہ یہودی قابل ذکر ہیں۔ان میں مثنویات کی ساری فضا مذہبی ہے اور اس میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ نمایاں ہے۔حکایت اویس قرنی کا انداز بیاں قابل دید ہے۔اس مثنوی میں حضرت اویس قرنی کے نادیدہ عشق کا قصہ ہے جن کے عشق پر نبی ﷺ نے وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کا پیرہن مبارک حضرت اویس کو پہنچا دیا جائے۔

ایک قبیلہ تھا یمن میں قرن　　تھا وہ اویس قرنی کا وطن
عاشق جانباز رسول خدا　　کشتہ انداز رسول خدا
شمع کی مانند سراپا گداز　　سوز سے پروانے کی مانند ساز
آنکھ اٹھاتا تھا یمن میں جدھر　　پڑتی تھی ماہ عربی پر نظر(۴۷)

آپ کی مثنویات اگر چہ کہ مذہبی مثنویات ہیں لیکن انداز بیان عشقیہ مثنویات جیسا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر مینائی قدیم انداز بیاں سے آخر وقت تک متاثر رہے موضوعات بے شک اسلامی اور مقصدی رہے لیکن اسلوب نگارش میں قدیم مثنویات کا رنگ جھلکتا ہے۔اگر چہ کہ مثنوی ''اویس قرنی'' میں محبوب سرکار دوعالم ﷺ کی ذات مبارکہ ہے لیکن اس کی تعریف میں روایتی محبوب کا عکس جھلکتا ہے۔

آنکھوں میں پھرتا تھا وہ حسن وجمال　　پیش نظر رہتا تھا وہ خط وخال
زلف کی لیتا تھا بلائیں کبھی　　تکتا حسرت سے ادائیں کبھی
نرگسی آنکھوں کا جو آتا تھا دھیان　　شوق سے کرتا تھا تصدق وہ جان
ہائے وہ اعجاز بھری چتونیں　　ہائے وہ سو ناز سے بھری چتونیں
وہ قد رعنا کی ادا دلفریب　　وہ سر اقدس وہ عمامے کی زیب

لیکن مثنوی میں جو تسلسل اور روانی مثنوی کی شان ہوتی ہے وہ اس مثنوی میں بھی موجود ہے جذبات نگاری،منظر کشی میں مثنوی ''قصہ اویس قرنی'' کسی سے کم نہیں۔اس کی بحر کے متعلق ابومحمد سحر لکھتے ہیں ''اس مثنوی میں امیر نے بڑی مترنم بحر اختیار کی ہے۔''(۴۸)

عاشق صادق نے یہ سن کر کلام　　پہلے کلیجا لیا ہاتھوں سے تھام
دوڑ کے پھر سر پہ اٹھایا اسے　　چوم کے آنکھوں سے لگایا اسے
مستی الفت نے دکھایا یہ رنگ　　وجد میں آیا ہوئی دونی ترنگ
پائے علی پر کبھی رکھتا تھا سر　　اور کبھی پھرتا تھا وہ گرد عمر

کہتا تھا اللہ رے میرے نصیب　　میرا بدن اور لباس حبیب

اسی طرح سے قصہ یہودی میں بھی اک یہودی کی نبی پاک ﷺ سے عشق کی داستان ہے۔ابتداً اسے رسول اکرم ﷺ کے نام سے بھی دشمنی تھی لیکن بعد میں تائید غیبی سے وہ رسول اللہ کا عاشق ہوگیا۔دیدار کی طلب میں مدینے پہنچا تو اپ ﷺ کا انتقال ہو چکا تھا اسی غم کی کیفیت میں وہ بھی فوت ہوجاتا ہے۔زبان وبیان اس کا بھی نہات سادہ ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ امیر مینائی نے آنے والے دور کی آواز پہلے سے ہی سن لی تھی انداز بالکل وہی ہے جو سرسید اور ان کے رفقاء کا ہے۔محاورات کے استعمال نے مثنوی کو زور بیاں عطا کیا ہے۔

دشمنی کا اثر کمال ہوا　　مارے غصے کے چہرہ لال ہوا

اڑ گیا رنگ رخ ہوا یہ قلق　　رکھ دیئے آگ میں وہ آٹھوں ورق

ہوگیا آئینہ وہ حیرت سے　　دل میں کہنے لگا یہ حسرت سے

جس قدر ان کو میں مٹاتا ہوں　　دوسرے روز دونے پاتا ہوں

ان مذہبی مثنویات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ امیر کا نعتیہ رنگ ان میں ابھر کر سامنے آتا ہے جہاں یہودی حضور ﷺ کے لباس کو ہاتھوں میں تھامتا ہے اس منظر کے اشعار دیکھیے نعت کا خوب صورت نمونہ ہیں۔

گیسوئے حور میں کہاں یہ بو　　شجر طور میں کہاں یہ بو

نہ یہ بو گلستاں کے پھولوں میں　　نہ یہ بوئے جناں کے پھولوں میں

باغ عرفاں کی بو یہی تو ہے　　گل ایماں کی بو یہی تو ہے

میں کہاں اور کہا ں یہ نکہت ہائے　　میں کہاں اور کہاں یہ خلعت ہائے

قصہ یہودی میں وہ حصہ زیادہ پر اثر ہے جب یہودی بہت شوق سے سرور کائنات سے ملنے آتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا انتقال پر ملال ہوگیا ہے۔

سنتے ہی یہ حکایتِ جانکاہ　　کھینچی اس نامراد نے اک آہ

لے کے حسرت سے نام سرور پاک ﷺ　　ہوکے بے تاب گر پڑا سر خاک

پیٹ کر سر پچھاڑیں کھانے لگا　　رو کے اوروں کو بھی رلانے لگا(۴۹)

غرض یہ کہ مذہبی مثنویات کی زبان وبیان نہایت سہل ہے۔اس میں محبت رسول ﷺ کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور سرسید تحریک کی سادگی وسلاست کا انداز بھی ہے۔امیر مینائی نے اس دور میں ہونے والی سرسید تحریک سے متاثر ہوکر نہ صرف اپنا انداز بدلا بلکہ زبان وبیان میں بھی سادگی اور سلاست کو جگہ دی۔

بہرکیف اک نور نامہ لیا　　نظر اس کے شعروں پہ کی جابجا

یہی دیکھ کر اس کو آیا خیال | کہ موزوں احادیث سے ہو یہ حال
کہاں پر حدیثوں میں سبط کلام | کہ ہو مثنوی اس سے موزوں تمام(۵۰)

اسلامی موضوعات رکھنے والی مثنویات کے حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام مثنویات ضعیف روایات پر مبنی ہیں لیکن نبیرہ امیر مینائی اسرائیل مینائی کا کہنا تھا کہ امیر مینائی نے ان تمام مثنویات کی روایت کو ضعیف مانتے ہوئے اس پر رجوع کیا ہے۔(۵۱)

مثنویات میں زبان و بیان کی سادگی اور اثر پزیری میر تقی میر کی مثنویات کی یاد دلاتی ہے۔امیرؔ نے عاشقانہ مثنوی بھی لکھی جس کے متعلق ممتاز علی آہ لکھتے ہیں۔نور تجلی کے علاوہ ایک بڑی عاشقانہ مثنوی بھی لکھی جو مثنوی میر حسن کی بحر میں ہے۔قصہ بہت دل چسپ ہے۔عاشقانہ مثنوی پر خالص لکھنوی رنگ کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح تمام واقعات، شہزادے کا ملکہ زہرہ جبیں کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہو جانا اور ملکہ کا بھی خواب میں شہزادے کو دیکھ کر بے قرار ہونا اور پھر بڑی مشکلات کے بعد پیر روشن ضمیر کی مدد سے ان کا ملاپ ہونا۔مثنوی کو کریم الدین احمد نے دریافت کر کے مرتب کیا اور رسالہ سہ ماہی ''اردو'' کے شمارہ جولائی۔اکتوبر ۱۹۶۰ء میں یہ شائع ہوئی۔(۵۲)مثنوی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر قدم پر احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک بلند پایہ شاعر کی بلند پایہ تصنیف ہے۔داستانی مثنوی میں شاعری کے جو جو پہلو ہو سکتے ہیں وہ سب اس نظم میں با حسن و خوبی روشن کیے گئے ہیں۔غرض یہ مثنوی لکھنوی دور کی یاد دلاتی ہے اور خالص لکھنوی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔(۵۳)

گلستاں گلستاں گل سرخ و زرد | پری بوٹہ بوٹہ، ہوا سرد سرد
کہیں نہر جاری، کہیں حوض آب | حسینوں کی آنکھوں سے بڑھ کر حباب
ہوا سے نہ ہلتے تھے برگ شجر | ہوا پر وہ کھولے تھے پریوں نے پر
زمرد کا تختہ اگر سبزہ زار | تو شبنم کے قطرے در شاہوار
چمن کوئی لالے کا دیکھا اگر | چراغاں دیوالی کا آیا نظر(۵۴)

عاشقانہ مثنوی میں زبان و بیان ''سحر البیان'' سے قدر مشترک ہے میرؔ کی طرح امیر مینائی نے بھی عشق پر ابتدائیہ اشعار لکھے ہیں اور کیا خوب لکھے ہیں:

محیط زمین و زماں عشق ہے | زمین عشق ہے آسماں عشق ہے
حبیب خدا ہیں رسول کریم | انہی سے ہے جاری یہ رسم قدیم
یہ وارفتۂ شوق دیدار تھے | تجلی کے موسیٰ طلب گار تھے
سنا نام بلقیس حیراں ہوئے | جو دیکھا تو عاشق سلیماں ہوئے
بڑھا رنگ الفت نہ گھٹ کر کہاں | زلیخا ہوئی پیر ہو کر جواں(۵۵)

عاشقانہ مثنوی کی منظر نگاری میں وہی جزئیات اور حسن پایا جاتا ہے جو مثنوی "سحر البیان" کا خاصہ ہے۔اگرچہ شہزادہ خواب میں شہزادی کو دیکھ کر فدا ہوتا ہے مگر خواب پر حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔اتنی فراغت اور فصاحت و بلاغت سے خواب دیکھنا شاید شہزادے کا ہی خاصہ تھا اور شاعر کا ہی تخیل تھا۔

ہوا شہزادہ جو حیران کار   صدا آئی ناگاہ ہاں ہوشیار
ٹھہر جا، نہ اک بڑھے پاؤں اب   مقام ادب ہے مقام ادب
یہاں شہزادی ہے رونق فروز   کہ شب جس کے پرتو سے ہوتی ہے روز
نہیں چشم خورشید کی یہ مجال   کہ دیکھے کسی روز نور جمال
قدم بوس کا ہو ارادہ اگر   پیادہ ہو گھوڑے سے نیچے اتر(۵۶)

بقول جمیل جالبی اس مثنوی میں میر حسن کی مثنوی کا رنگ غالب ہے وہی بحر اور وہی اوزان،اسی طرح اشعار میں بھی میر حسن کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔اگرچہ مثنوی میر حسن کی مثنوی کے مقابل تو نہیں لیکن موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اسی رنگ میں ہے۔(۵۷)اگرچہ امیر کے عہد کے ڈانڈے دور جدید سے ملتے ہیں لیکن امیر مینائی بنیادی طور پر روایت پسند شاعر ہیں روایت سے تعلق کی بناء پر ان کے کلام میں ہ سارے کنایات،تلمیحات ورمزیات موجود ہیں جن سے یہ روایت عبارت ہے۔مثلاً سایہ دیوار،محتسب،مرغ ودام،گل وعندلیب،نقش بوریا وغیرہ۔امیر مینائی کی مثنویات کا دوسرا دور تب شروع ہوا جب آپ رام پور آئے۔آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے معزول ہونے کے بعد لکھنو میں بھی شعراء کا کوئی سر پرست نہ رہا اور یہ سب منتشر ہو کر رام پور،حیدر آباد،ٹونک اور بھوپال وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے رام پور کا رخ کیا۔اس کا سبب یہ تھا کہ یوسف علی خان ناظم تاجدار رام پور خود صاحب علم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ان کے عہد میں جن شعراء نے رامپور میں سکونت اختیار کی ان میں امیر مینائی بھی شامل تھے،یوسف علی خان کے دربار میں لکھنو اور دہلی کے اساتذہ یک جا ہوئے اور ان کے سنگم سے ایک نئے اسکول کی بنیاد پڑی۔دہلی اسکول کے نمائندے داغ اور تسلیم تھے اور لکھنؤ کے بحر،جلال اور امیر تھے۔اس کا نتیجہ شخصی مثنویات کا عہد رام پور میں شروع ہوا۔یہاں نواب کلب علی خان کی تاج پوشی پر مثنویاں لکھی گئیں ہیں جو مثنوی کی بدلتی ہوئی صورتحال کو واضح کرتی ہے۔

سپاس خدائے مہ و آفتاب   کہ جس نے بنائے مہ و آفتاب
فلک پر کواکب کو رخشاں کیا   گلوں سے زمیں کو گلستاں کیا
کیا بادشاہوں کو فرخندہ بخت   ہوئی ان سے آرائش تاج وتخت(۵۸)

ایک مثنوی فارسی میں بھی رقم کی گئی اس کے علاوہ کارنامہ عشرت جیسی مثنوی بھی اس دور میں تخلیق کی گئی۔مثنوی" کارنامہ عشرت" یہ بھی تاریخی نام ہے۔جس سے ۱۲۸۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔یہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔اس

مثنوی میں نواب ذوالفقار کی شادی کا موضوع ہے یہ مثنوی بھی اسی روایتی انداز میں ہے۔

دکھا شان مشاطگی اے قلم　　اگر تجھ کو صورت گری کا ہے دم
عروس سخن کو کر آراستہ　　لباس اور زیور سے پیراستہ
بہت صاف معانی سے واقف ہے تو　　یہی آئینہ لا کے رکھ روبرو
صفاہاں کا سرمہ ہے رنگ مداد　　لگا اس کو آنکھوں میں رکھ اس کو یاد(۵۹)

امیر مینائی کے انداز میں بغاوت نہ تھی۔وہ ہر چیز کا اثر قبول کنے کی صلاحیت رکھتے تھے،اسی لیے انھوں نے مثنوی کی بدلتی ہوئی روایات کو اپنایا۔

یہ وہ دور تھا جب نئے خیالات اور موضوعات شاعری کا حصہ بن کر رہے۔قدیم مثنویوں کا موضوع عشق اور عشقیہ افسانہ تھا۔جدید مثنوی میں عشق کا کوئی مقام نہ تھا۔امیرؔ نے بھی اس جدت کو محسوس کیا اس لیے ان کی مثنویات میں داستانی فضا ناپید تھی۔تمام شخصی مثنویات میں زبان وبیان بھی سادہ ہے اور جدید رنگ بھی نظر آتا ہے۔نواب کلب علی خان کی خلعت پوشی پر یوں مثنوی تحریر کی ہے۔

ہوا تازہ سامان جشن جلوس　　شگفتہ گلستان جشن جلوس
ملے اہل خدمات کو رنگین لباس　　بٹے سب کو انعام بھی بے قیاس
یہ شہر آراستہ دیکھا ہے جیسا　　کوئی کشور نہیں عالم میں ایسا(۶۰)

تاج پوشی پر لکھی جانے والی مثنوی کا انداز بیاں کچھ یوں ہے۔

جواہر سے رنگ لطافت عیاں　　چمن بن گیا جوہری کی دکاں
زہے چہرہ تابناک چمن　　شفق بن گئی اڑ کے خاک چمن
زمین چمن ہے اگر آسماں　　روش اس میں ہے صورت کہکشاں(۶۱)

عمر کے آخیر حصے میں جب امیر اللغات کے لیے انھیں مالی مدد درکار تھی تو انھوں نے میر محبوب علی خان کے نام مثنوی لکھی تھی جس کا انداز یکسر مختلف تھا۔

کہ اک خطہ ہے لکھنؤ جس کا نام　　تہہ آسماں رشکِ دارالسلام
وہی ہے بزرگوں کا میرے وطن　　وہی مولد ومسقط خستہ تن
اسی شغل میں اک دن آیا خیال　　کہ ڈھونڈوں کوئی قدر دان کمال(۶۲)

الغرض امیر مینائی کی مثنویات میں کوئی مخصوص انفرادیت موجود نہیں ہے۔لیکن ان کی شاعری کو اگر روایات کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی کی قدیم روایت اب امیر اور داغ پر ختم ہوگئی ہے۔امیر مینائی ایسے شاعر

تھے جو روایات کے بنے ہوئے سانچے میں ڈھل جاتے تھے۔ وہ عشقیہ موضوعات معاشرے سے اخذ کرتے تھے اور چوں کہ ان کی ذات تمام مذہبی روایات میں رچی تھیں اس لیے انھوں نے عشقیہ اور مذہبی دونوں موضوعات کو مثنوی میں برتا اور خوب برتا۔ جہاں تک شخصی مثنویات کا تعلق ہے تو زیادہ تر شخصی مثنویات کا تعلق رام پور کی شاہانہ زندگی سے تھا۔ اک عدد مقصدی مثنوی بھی ملتی ہے جو میر محبوب علی خان کے نام ہے جس میں امیر اللغات کے لیے مدد کی استدعا موجود ہے۔(۶۳)

امیر کی مثنویات نے اردو شاعری میں کوئی بڑا کارنامہ تو انجام نہ دیا لیکن ان کی مثنویات کی وجہ سے ہمیں اس دور کے بادشاہوں کا مزاج اور اس دور کی سیاسی و معاشرتی صورتحال کا باخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپ کی مثنویات لکھنؤ اور رام پور کے تہذیبی پس منظر کی بھرپور عکاس ہیں۔

حواشی

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء) ص ۲۵
۲۔ نورالحسن ہاشمی، دہلی کا دبستان شاعری (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء) ص ۲۲۰
۳۔ مسعود نیر رضوی، لکھنؤ کا عروج و زوال، مشمولہ نقوش، لاہور، شمارہ ۱۷۔ ص ۳۲۰
۴۔ ابو محمد سحر، مطالعہ امیر (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۵ء)، ص ۹۷
۵۔ ابو اللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، (لاہور: مطبوعہ اردو، ۱۹۴۴ء) ص ۵۶
۶۔ ایضاً، ص ۵۴
۷۔ ایضاً
۸۔ آفتاب احمد صدیقی، صہبائے مینائی (ڈھاکہ: مکتبہ عارفین، ۱۹۲۴ء)، ص ۶۳
۹۔ ایضاً، ص ۱۶
۱۰۔ جلیل مانکپوری، سوانح امیر مینائی، (حیدر آباد دکن: ندارد، ۱۳۴۷ھ)، ص ۵۸
۱۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ اردو ادب (لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۹۲۹ء)، ص ۲۳۹
۱۲۔ شیخ وحید الزماں کی چھوٹی صاحب زادی سے امیرؔ کی نسبت قرار پا چکی تھی۔
۱۳۔ ابو محمد سحر، مطالعہ امیر ص ۱۹۷
۱۴۔ راحت محمود، دربار رام پور اور امیر مینائی''، مشمولہ رسالہ صحیفہ، لاہور، شمارہ۔ ۱۵، ص ۱۲۰
۱۵۔ محمد عزیز اللہ خان عزیز رام پوری، امیر مینائی اور ان کے فضل و کمال پر اک نظر مشمولہ نیرنگ، امیر مینائی، خاص نمبر، ۱۹۲۹ء، ص ۳
۱۶۔ ابو محمد سحر، مطالعہ امیر، ص ۸۷
۱۷۔ سید محمد عبدالحکیم، صاحب حکمت عالم گنجی، دبدبہ امیری (پٹنہ: مطبوعہ برقی مشین پریس مراد پور، ۱۹۳۷ء)، ص ۱۶
۱۸۔ ابو محمد سحر، مطالعہ امیر، ص ۱۰۸

۱۹۔ آفتاب احمد صدیقی، صہبائے مینائی، ص ۱۲۴

۲۰۔ سید جلال الدین، تاریخ مثنویات اردو (لاہور: شرکت مصنّفین، سن ندارد)، ص ۱۷

۲۱۔ غالب و مومن، آتش و جرات کے زمانے کا ذکر ہے۔

۲۲۔ عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۶۸ء)، ص ۱۲۰

۲۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی بہترین مثنویاں (لاہور: نذیر سنز پبلشرز، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۲

۲۴۔ عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا، ص ۶۵

۲۵۔ سید جلال الدین، تاریخ مثنویات اردو، ص ۱۸

۲۶۔ محمد یوسف خورشیدی، مشترکہ تہذیب اور اردو مثنوی مشمولہ معاصر، لاہور، شمارہ ۶۲، ص ۲۴

۲۷۔ ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، محولہ بالا، ص ۵۰

۲۸۔ مرزا شوق لکھنوی، زہرِ عشق، مشمولہ: مثنویاتِ شوق (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۸ء)، ص ۴۰

۲۹۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو کی بہترین مثنویاں، ص ۱۴۰

۳۰۔ گیان چند جین، اردو مثنوی شمالی ہند میں، (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۳۹

۳۱۔ مرزا شوق، مثنویاتِ شوق (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۸ء)، ص ۴۳

۳۲۔ جلال الدین، تاریخ مثنویات اردو، ص ۴۵

۳۳۔ فرمان فتح پوری، اردو کی بہترین مثنویاں، ص ۱۶۲

۳۴۔ کندن لال کندن، تاریخی مثنویاں تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ (دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۱۹۹۱ء) ص ۲۰۲

۳۵۔ عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا، ص ۱۴۸

۳۶۔ جلال الدین، تاریخ مثنویات اردو، ص ۳۴

۳۷۔ عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا، ص ۲۳

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۳۹۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۱۲ء) ص ۴۲۰

۴۰۔ حفیظ جالندھری، شاہنامہ اسلام، (لاہور: مرکنٹائل پریس، ۱۹۳۷)، ص ۲۵

۴۱۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، ص ۴۲۳

۴۲۔ ابومحمد سحر، مطالعہ امیر، ص ۷۷

۴۳۔ ممتاز علی آہ، امیر مینائی، (لکھنؤ: ادبی پریس، ۱۹۴۱ء) ص ۵۸

۴۴۔ ابومحمد سحر، مطالعہ امیر، ص ۳۰۴

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۰۵

۴۶۔ گیان چند جین، شمالی ہند میں مثنوی، ص ۱۶۹

۴۷۔ مثنوی قصہ اویس قرنی غیر مطبوعہ جو نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

۴۸۔ ابومحمد سحر، مطالعہ امیر، ص ۳۰۹

۴۹۔ مثنوی قصہ یہودی غیر مطبوعہ جو نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

۵۰۔ امیر مینائی کی مطبوعہ مثنوی ابرِ کرم، (حیدرآباد دکن: امیر المطابع، ۱۲۹۴ھ)، ص ۲۱
۵۱۔ ممتاز علی آہ، امیر مینائی، ص ۳۹۳
۵۲۔ آفتاب احمد صدیقی، صہبائے مینائی، ص ۱۱۲
۵۳۔ ابومحمد سحر، مطالعہ امیر، ص ۳۰۵
۵۴۔ مثنوی عاشقانہ غیر مطبوعہ جو نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۵۵۔ عاشق مثنوی، غیر مطبوعہ جو نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۵۶۔ مثنوی غیر مطبوعہ جو نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۵۷۔ جمیل جالبی، تاریخ اردو ادب، ص ۴۶۷
۵۸۔ مثنوی غیر مطبوعہ جو نواب کلب علی خان کی شان میں لکھی گئی اور نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۵۹۔ مثنوی کارنامہ عشرت مطبوعہ جو نواب کلب علی خان کے صاحبزادے کی شادی پر لکھی گئی۔
۶۰۔ مثنوی غیر مطبوعہ جو نواب کلب علی خان کی خلعت پوشی پر لکھی گئی، نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۶۱۔ مثنوی غیر مطبوعہ جو نواب کلب علی خان کی رسم تاج پوشی پر لکھی گئی، نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۶۲۔ یہ مثنوی میر محبوب علی خان کے نام ہے جو غیر مطبوعہ ہے، نبیرہ امیر مینائی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔
۶۳۔ ایضاً

مآخذ:

۱۔ آہ، ممتاز علی، سیرتِ امیر مینائی، لکھنؤ: ادبی پریس، ۱۹۴۱ء۔
۲۔ جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء
۳۔ جالندھری، حفیظ، شاہنامہ اسلام، لاہور: مرکنٹائل پریس، ۱۹۳۷ء
۴۔ جلال الدین، سید، تاریخ مثنویات اردو، لاہور: شرکت مصنّفین، سن ندارد
۵۔ جین، گیان چند، اردو مثنوی شمالی ہند میں، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء
۶۔ حکمت، سید محمد عبدالحکیم، عالم گنجی، دبدبہ امیری، پٹنہ: مطبوعہ برقی مشین پریس مراد پور، ۱۹۳۷ء
۷۔ سحر، ابومحمد، مطالعہ امیر، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۵ء
۸۔ سروری، عبدالقادر، اردو مثنوی کا ارتقا، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۶۸ء
۹۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ اردو ادب، لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۹۲۹ء
۱۰۔ شوقؔ، مرزا، مثنویاتِ شوق، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۸ء
۱۱۔ صدیقی، آفتاب احمد، صہبائے مینائی، ڈھاکہ: مکتبہ عارفین، ۱۹۲۴ء
۱۲۔ صدیقی، ابواللیث، لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور: مطبوعہ اردو، ۱۹۴۴ء
۱۳۔ فتح پوری، فرمان، اردو کی بہترین مثنویاں، لاہور: نذیر سنز پبلشرز، ۲۰۱۴ء
۱۴۔ کندن، کندن لال، تاریخی مثنویاں تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ، دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۱۹۹۱ء

۱۵۔ مانکپوری،جلیل،سوانح امیر مینائی، حیدرآباد دکن: ندارد، ۱۳۴۷ھ
۱۶۔ مینائی، امیر،مثنوی ابرِ کرم،حیدرآباد دکن: امیر المطابع، ۱۲۹۴ھ
۱۷۔ ہاشمی، رفیع الدین، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
۱۸۔ ہاشمی، نورالحسن، دہلی کا دبستان شاعری، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء

رسائل:

۱۔ صحیفہ، لاہور، شمارہ۔۱۵
۲۔ نقوش، لاہور، شمارہ۔۱۷
۳۔ نیرنگ، امیر مینائی، خاص نمبر، ۱۹۲۹ء، ص ۳